حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۶)

حضرت حُجرؓ کی فردِ جرم اب ہم اُس فردِ جرم کی ایک ایک شق کو لیتے ہیں جسے عثمانی صاحب نے حضرت حُجرؓ کو باغی ثابت کرنے کے لیے بڑی جزرسی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ پہلا الزام اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضرت حجرؓ امیر معاویہ کی حکومت کے خلاف تھے اور وہ حضرات حَسنینؓ کو بھی بار بار بغاوت پر اُکساتے رہے، لیکن یہ دونوں بزرگ کسی قیمت پر بھی امیر معاویہ کے خلاف اٹھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خلافت کا آلِ ابی طالب کے سوا کوئی مستحق نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی خلیفہ کی حکومت کو خوشدلی سے تسلیم نہ کرنا اور کسی دوسرے کو اس کے خلاف اُکسانا، یا کسی کو کسی کے مقابلہ میں خلافت کا مستحق سمجھنا شرعًا جرمِ بغاوت کی تعریف میں نہیں آتا، بالخصوص جبکہ اس اُکساہٹ کی حوصلہ شکنی دوسرے کی جانب سے ہو جائے اور عملًا کوئی بغاوت برپا نہ ہو۔ حضرت سَعد بن عُبادہؓ نے آخر دم تک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی اور وہ انصار کو مستحقِ خلافت سمجھتے تھے۔ یہ مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے پیچھے نماز پنجگانہ اور جمعہ نہیں پڑھتے تھے، نہ ان کی قیادت میں حج کرتے تھے۔ اگر انہیں ساتھی مل جاتے تو وہ ان سے جنگ آزما ہونے سے بھی تامل نہ کرتے لیکن کسی نے انہیں باغی قرار دے کر نہ قید کیا، نہ قتل کیا۔ دوسرا مشہور تاریخی واقعہ حضرت امیر معاویہؓ کے والد ماجد حضرت ابوسفیانؓ کا ہے جسے استیعاب اور دوسری کتابوں میں بیان کیا گیا ہے جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی تو ابوسفیانؓ حضرت علیؓ کے پاس آکر کہنے لگے کہ "یہ کیا ہوا کہ قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے نے خلافت پر قبضہ کر لیا؟ اے علی، اگر تم پسند کرو تو خدا کی قسم میں اس وادی کو پیادوں اور سواروں سے بھر سکتا ہوں"۔ حضرت علیؓ نے

جواب میں فرمایا کہ "تم ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کے دشمن بنے رہے، مگر اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی ضرر نہ پہنچ سکا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ابوبکر منصبِ خلافت کے اہل ہیں۔" یہ واقعہ متعدد کتابوں میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے، حتیٰ کہ امام ابنِ تیمیہؒ نے بھی اسے منہاج السنّۃ میں کئی بار نقل کیا ہے، بلکہ یہاں تک لکھ دیا ہے:

فقد اراد ابوسفیان وغیرہ ان تکون الامارۃ فی بنی عبد مناف علی عادۃ الجاھلیۃ فلم یجبہ الی ذالک علی ولا عثمان ولا غیرھما لعلمھم ودینھم[۱] ابوسفیان اور کچھ دوسروں نے چاہا تھا کہ جاہلیت کے طریقے کے مطابق امارت بنو عبد مناف میں ہو مگر حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرام نے اپنے علم و تدیّن کی بنا پر ان کی اس خواہش کی حوصلہ افزائی نہ کی۔" اب میں عثمانی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اگر حضرت حُجرؓ، حضرت حسنؓ یا حسینؓ کو امیر معاویہؓ کے خلاف اُکسانے کی بنا پر جُرمِ بغاوت کے مُرتکب تھے، تو کیا حضرت ابوسفیانؓ اِس جُرم کے بدرجۂ اَولیٰ مُرتکب نہ تھے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے بھی انہیں اِس جُرم میں مأخوذ نہ کیا؟

دوسرا جُرم حضرت حُجرؓ کا عثمانی صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر کھلم کھلا طعن کرتے تھے، حالانکہ حضرت معاویہؓ کے کسی گورنر نے کبھی حضرت علیؓ کی شان میں ایسی کوئی بات نہیں کہی لیکن اُمرائے معاویہؓ کی بات بات پر اُن کے خلاف شورش کرنا حضرت حُجرؓ اور اُن کے ساتھیوں کی عادت بن گئی تھی۔ سبّ و شتمِ علیؓ و اہلِ بیت کے مسئلے پر جو مفصل بحث میں کر چکا ہوں، اس کے بعد نہیں معلوم کہ عثمانی صاحب اب بھی اس دعوے سے رجوع فرمائیں گے یا نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے کسی گورنر نے حضرت علیؓ کی شان میں کبھی کوئی بُری بات نہیں کہی۔ میں نے ناقابلِ انکار حوالوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طعن و تشنیع اور سبّ و شتم کا آغاز امیر معاویہؓ اور ان کے گورنروں کی جانب سے ہوا تھا اور حضرت حُجرؓ یا کسی دوسرے صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کی جو صورت بھی اختیار کی ہے وہ ایک جوابی رَدِّ عمل تھا۔ اور اگر اس طعن و تعریض کا نام بغاوت ہے، تو خلیفۂ راشد کی موجودگی اور ان کے عہدِ خلافت میں جنہوں نے اس فعل کو انجام دیا، سب سے پہلے بغاوت کے مرتکب وہ ہوں گے اور ان کا جُرم جوابی احتجاج کرنے والوں کے بالمقابل سنگین تر ہوگا۔ میں کہتا

---

[۱] ملاحظہ ہو منہاج السنّۃ جلد اول ص ۱۶۱ المطبعۃ الامیریہ، بولاق مصر ۱۳۲۱ھ، جلد ثانی ص ۱۹۶ جلد رابع ص ۱۳۳۔

ہوں کہ سب وشتم کا آغاز اور اس کے جواب میں سب وشتم جس نے بھی کیا ہے، بہت برا کیا ہے۔ آج بھی جو ایسا کرتا ہے، بہت برا کرتا ہے۔ لیکن یہ جرم بغاوت کے مترادف نہیں، نہ اس کی سزا قتل ہے۔ بعض علمائے سلف اس بات کے قائل تو ہوئے ہیں کہ شاتم رسولؐ واجب القتل ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے سوا کسی دوسرے کی بدگوئی کرنا یا اُسے گالی بھی دے دینا اسلام میں ہرگز موجبِ قتل نہیں[1]۔ حضرت حجرؓ بن عدی کے خلاف بغاوت اور سزائے قتل کا مقدمہ تیار کرتے وقت مدیر "البلاغ" کا یہ کہنا کہ فلاں گورنر کے سامنے انہوں نے لعن طعن کیا، ایک خواہ مخواہ کا خلطِ مبحث ہے۔ اگر ایک گورنر علانیہ ایک صحابی کو، اور وہ بھی معمولی صحابی نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین عزیز اور خلیفہ راشد کو، آن کی وفات کے بعد گالیاں دے رہا ہو جسے حضرت ام سلمہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب وشتم قرار دیا ہے، اس پر کوئی مسلمان مشتعل ہو کر اس کا ترکی بہ ترکی جواب دے تو اسے بغاوت، اور وہ بھی مستوجب قتل بغاوت قرار دینے کی جرأت صرف عثمانی صاحب ہی کر سکتے ہیں۔

یہ چیز فی الواقع میرے لیے سخت موجبِ حیرت ہے کہ حضرت حجرؓ بن عدی کی قیام کوفہ کے دوران میں انتشار پسندانہ اور باغیانہ سرگرمیوں کی داستان تو "البلاغ" میں لمبی چوڑی بیان کر دی گئی ہے، لیکن امیر معاویہؓ کے گورنروں کے اُس طرزِ عمل کو بالکل ہی گول کر دیا گیا ہے جس کے ردِ عمل میں وہ ساری سرگرمیاں ظہور میں آئیں جن پر بغاوت کا ٹھپہ لگایا جا رہا ہے۔ مؤرخ ابن خلدون، جنہوں نے مولانا محمد تقی صاحب کے بقول اس دریائے خون میں بڑی سلامت روی سے شناوری کی ہے، اپنی تاریخ (ج ۳، ص ۱۰) میں جہاں اُن واقعات کا آغاز کرتے ہیں جو حضرت حجرؓ کے قتل پر منتج ہوئے، وہاں وہ بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے ہیں کہ: کان المغیرۃ بن شعبۃ ایام امارتہ علی الکوفۃ کثیراً ما یتعرض لعلی فی مجالسہ وخطبہ "مغیرہؓ بن شعبہ کوفہ کی

---

[1] موجبِ قتل تو درکنار موجبِ تعزیر بھی نہیں۔ حضرت علیؓ کی حدودِ سلطنت میں رہ کر خوارج انہیں گالیاں دیتے تھے مگر اس پر حضرت علیؓ اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرتے تھے۔ اس پر امام سرخسی مبسوط، ج ۱۰ ص ۱۲۵ میں فرماتے ہیں وفیہ دلیل علی ان التعریض بالشتم لا یوجب التعزیر "اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ فرمانروا کو گالی دینا موجبِ تعزیر نہیں ہے۔"

امارت کے زمانہ میں اکثر اپنی مجالس اور خطبوں میں حضرت علیؓ پر طعن و تعریض کرتے تھے" اس کے بعد زیاد نے جو طوفان بدتمیزی وہاں بپا کیا اور جن مظالم کا ارتکاب کیا، وہ تو رسوائے روزگار ہیں۔ جگہ جگہ مدیر البلاغ خود تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ حضرت حجرؓ کو بار بار قتل کی دھمکیاں دیتا تھا اور کہتا تھا کہ میں کوفہ کی زمین کو حجر سے پاک نہ کر دوں اور اسے آنے والوں کے لیے سامانِ عبرت نہ بنا دوں تو میں بھی کوئی چیز نہیں۔ اس کے باوجود مدیر موصوف کے تجاہلِ عارفانہ کا یہ عالم ہے کہ فرماتے ہیں کہ واقعے کی تمام تفصیلات دیکھنے کے بعد ہمیں تو زیاد کے بارے میں کہیں یہ نظر نہ آسکا کہ اس نے اصولِ شرع کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔ زیاد کے سفاکانہ جرائم کا حال میں ابن خلدون وغیرہ کی زبانی پہلے نقل کر چکا ہوں۔ استیعاب میں حافظ ابن عبد البر نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جب زیاد کو عراق کا والی بنایا تو اس نے درشتی اور بدخلقی کا مظاہرہ کیا (اظھر من الغلظة وسوء السيرة۔ استیعاب، ج ۱، ص ۲۵۵)۔

حضرت حجرؓ کے خلاف بغاوت کے الزام کو آخری حد تک پہنچانے کے لیے انتشار پسندی اور سب و شتم کے علاوہ مزید الزام جو عثمانی صاحب نے لگایا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھیوں نے گورنر کوفہ پر پتھر برسائے اور باقاعدہ لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑائی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تیسرے الزام کو ثابت کرنے کے لیے جو کھینچ تان کی گئی ہے اور جس طرح پر کاکوا اور سُوئی کا بھالا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ مثال کے طور پر مؤرخین کے بیان کے مطابق زیاد کو بصرے میں اطلاع دی گئی کہ حضرت حجرؓ کے پاس شیعانِ علیؓ جمع ہوتے ہیں۔ وانھم حصبوا عمرو بن حریث، اور انہوں نے حضرت عمروؓ بن حریث کو (جو کوفے میں زیاد کے نائب تھے) کنکریاں ماری ہیں۔ اس کا ترجمہ البلاغ صلا میں یہ کیا گیا ہے کہ "انہوں نے پتھر برسائے ہیں"۔ آخر میں صٓ پر جہاں جرم بغاوت کے اجزائے ترکیبی کو دُہرایا گیا ہے وہاں عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ "گورنر کوفہ حضرت عمروؓ بن حریث پر پتھر برسائے"۔ عثمانی صاحب کو چاہیے تھا کہ ساتھ ہی یہ بھی اضافہ فرما دیتے کہ ان پتھروں کی بارش سے کچھ لوگ زخمی یا ہلاک بھی ضرور ہوتے ہونگے اور مؤرخین نے اگر اس کا ذکر نہیں کیا تو یہ عدم ذکر ہی تو ہے، ذکرِ عدم تو نہیں[1]۔

---

[1] اس سلسلہ مضامین میں خطبوں کے دوران میں کنکریاں پھینکنے کا ذکر بار بار آ رہا ہے۔ اس سے قارئین کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ کچھ نمازی طے شدہ پروگرام کے مطابق شاید باہر سے کنکر لے کر مسجد میں داخل ہوتے ہوں گے۔ دراصل اس زمانے میں

اس کے بعد جو واقعات البلاغ میں نقل کیے گئے ہیں، وہ مختصراً یہ ہیں: "زیاد اس کے بعد خود کوفے میں آیا، ایک طویل خطبہ دیا، جب نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو حجرؓ نے اس پر بھی کنکریاں دے ماریں۔ زیاد نے سارے حالات حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجے۔ انہوں نے حکم دیا کہ حجر کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ زیاد نے پولیس افسر کے ذریعے سے انہیں بلوایا مگر انہوں نے انکار کیا۔ زیاد نے زیادہ آدمی دے کر بھیجا کہ انہیں لے آؤ، ورنہ ان سے لڑائی کرو۔ اس پر فریقین میں لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑائی ہوئی[1] مگر حجر گرفتار نہ ہو سکے اور فرار ہو کر کندہ کے محلے میں پہنچے۔ یہاں بھی جنگ ہوئی اور ایک شخص نے رزمیہ اشعار پڑھے کہ "اے حجر کی قوم، دفاع کرو اور حملہ کرو اور اپنے بھائی کی طرف سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہاں سے حجر پھر فرار ہو کر روپوش ہو گئے۔ آخر کار امان کی شرط منوا کر وہ خود ہی زیاد کے سامنے پیش ہو گئے۔"

اس کے بعد عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ حجر کے دوسرے ساتھی بدستور روپوش رہے۔ نہ معلوم کس مصلحت کی بنا پر یہ نہیں بتایا کہ بعد میں وہ بھی گرفتار ہو گئے، حالانکہ آخر میں جا کر ان چودہ آدمیوں کا امیر معاویہ کے پاس بحالتِ گرفتاری جانا مذکور ہے جن میں سے چھ کو چھوڑ دیا گیا اور آٹھ کو قتل کر دیا گیا۔

حضرات حسنین کو خروج پر اکسانے اور حضرت علیؓ پر سب و شتم کے جواب میں امیر معاویہؓ اور ان کے گورنروں پر سب و شتم کرنے کے بعد حضرت حجرؓ نے زیاد اور اس کی پولیس کے خلاف مزاحمت کی جو روش اختیار کی، یہ گویا عثمانی صاحب کی دانست میں وہ آخری اور اہم ترین کڑی ہے جو جرم بغاوت کو پایۂ تکمیل و اثبات

مسجد کے فرش کچے ہوتے تھے اور ان پر چھوٹے چھوٹے سنگریزے بچھا دیئے جاتے تھے۔ بعض لوگ انہی کو اٹھا کر بحالتِ طیش پھینک دیتے تھے، جسے عثمانی صاحب نے سنگباری بنا دیا ہے۔

[1] اس "لڑائی" کی تفصیل ابن اثیر نے الکامل میں یہ دی ہے کہ جب زیاد کی پولیس لاٹھیاں برسانے لگی تو ایک شخص نے ایک لاٹھی چھین لی، اس سے لڑ کر اس نے حجر اور ان کے ساتھیوں کی جان بچائی یہاں تک کہ وہ کندہ کے دروازوں سے نکل بھاگے (اخذ عمودًا من بعض الشرط فقاتل به وحمی حجرًا واصحابه حتی خرجوا من ابواب الکندہ۔ الکامل، ج ۳ ص ۲۳۵)
مورخین نے اس پورے ہنگامے کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان میں صرف ایک مرتبہ تلوار کے استعمال کا ذکر میری نظر سے گزرا ہے جس کی ضرب سے ایک شخص منہ کے بل گر پڑا۔

تک پہنچا دیتی ہے۔ میں اسلام کے قانونِ بغاوت کی ضروری تفصیل پہلے بیان کر چکا ہوں اور یہ بتا چکا ہوں کہ جرمِ بغاوت کے ثابت و متحقق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مجرمین کا ارادہ یہ ہو کہ وہ نظامِ حکومت کو انقلابی اور متشددانہ ذرائع سے تہ و بالا کر دیں اور امامِ عادل کے خلاف مسلح خروج کے مرتکب ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بھی لابدی ہے کہ مجرم ایسی مادی طاقت و سطوت و مَنَعَۃ کے مالک ہوں اور آتنی جمعیت اور آلاتِ حرب رکھتے ہوں کہ قتال بالسیف کے بغیر ان کا قلع قمع نہ ہو سکتا ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ حضرت حُجرؓ جن کے بارے میں حضرت علیؓ کا یہ قول عثمانی صاحب نے خود نقل کیا ہے کہ "مجھے گمان نہ تھا کہ یہ بیچارہ حُجر ضعف کے اس درجے کو پہنچ گیا ہوگا جو میں دیکھ رہا ہوں" اور جن کے بارے میں مؤرخین کا بیان ہے کہ زیاد کی پولیس سے فرار کے وقت وہ بغیر سہارے کے سواری پر جم کر بیٹھ بھی نہ سکتے تھے، ایسے شیخ فانی اور ان کے چند ساتھی جو اُن کے پاس مسجد یا گھر میں جمع ہو جاتے تھے، کیا اُن پر بغاۃ کی شرعی اصطلاح کا اطلاق کسی لحاظ سے بھی درست ہوگا؟ کیا یہ کوئی ایسی زبردست اور ناقابلِ تسخیر جمعیت تھی جس کے خلاف فوج کشی کی گئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ پولیس ایکشن کے ذریعے سے ان کی سرکوبی اور گرفتاری اسی لیے تو ممکن ہوئی کہ وہ تعداد یا اسلحہ کے لحاظ سے کوئی طاقتور اور صاحبِ مَنَعَت گروہ تھے ہی نہیں۔ حضرت حُجرؓ کے حالات کے تحت استیعاب میں مسروقؒ کی روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا: لو علم معاویة ان عند اهل الكوفة مَنَعة ما اجترأ على ان یأخذ حُجراً واصحابه من بینهم حتی یقتلهم بالشام۔ "اگر معاویہ کو یہ معلوم ہوتا کہ اہلِ کوفہ کوئی طاقت رکھتے ہیں تو وہ اس بات کی جرأت نہ کرتے کہ حُجرؓ اور ان کے رفقاء کو ان کوفے والوں کے درمیان سے پکڑ لیتے اور شام میں لے جا کر انہیں قتل کر دیتے۔" گویا کہ حضرت حُجر اور اُن کے ساتھی تو در کنار حضرت عائشہؓ کے نزدیک سارے کوفے والے مل کر بھی اہلِ مَنَعہ نہیں تھے، جن پر باغیوں کا اطلاق ہو سکتا۔ مگر ہمارے مفتی صاحب ان کے باغی اور لائقِ قتل ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں! پھر ان باغیوں کا حال یہ تھا کہ ان چودہ آدمیوں کو پابندِ سلاسل کرنے کے بعد صرف دو آدمی انہیں بھیڑوں کی طرح ہانک کر دمشق تک اور پھر وہاں سے مرج عذراء[1]

---

[1] مرج عذراء کا علاقہ وہ ہے جو سب سے پہلے حضرت حُجرؓ بن عدی ہی کے ہاتھ پر فتح ہو کر اسلامی سلطنت میں شامل ہوا تھا۔ تاریخوں میں منقول ہے کہ اس دیار میں سب سے پہلے تکبیر بلند کرنے والے وہی تھے اور تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ اسی مقام پر یہ قتل بھی کیے جائیں۔

کے جنگل تک لے گئے اور وہاں آدھوں کو ذبح کر دیا گیا لیکن ان کے مفرور اور روپوش ساتھیوں یا دوسرے ہوا خواہوں میں سے کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا، نہ قتل کے بعد ہی کسی نے حرکت کی۔ یہ وہ باغی ہیں جن کے بارے میں یہ فرمایا گیا کہ اگر یہ قتل نہ ہوتے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کرنا پڑتا!

ان "باغیوں" کی جو جھڑپ کندہ میں زیاد کی پولیس سے ہوئی ہے اور اس میں جو زد و خورد ہوئی ہے اُسے "البلاغ" میں ایک باقاعدہ جنگ سے تعبیر کیا گیا جس میں لاٹھیاں اور پتھر استعمال ہو رہے تھے اور رزمیہ اشعار پڑھے جا رہے تھے۔" یہ بھی یاد رہے کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جبکہ ہر گھر میں تیر، تلوار، برچھے، نیزے تیار رہتے تھے۔ مگر فریقین نے لڑائی بھی لڑی تو پتھر یا لاٹھی سے جو اسلحہ یا آلۂ جارحہ کی تعریف ہی میں نہیں آسکتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جہاں تک حضرت حُجرؓ اور ان کے ساتھیوں کا تعلق ہے، وہ آلاتِ حرب سے اس لیے مسلح نہ تھے کہ وہ باقاعدہ جنگ کی طاقت اور نیت نہیں رکھتے تھے اور زیاد کے آدمی اسلحہ سے اس لیے لیس نہیں ہوئے کہ انہوں نے اس کا استعمال غیر ضروری سمجھا اور اس کے بغیر ہی شورش کو فرو کر لیا۔ اس مٹھ بھیڑ اور پکڑ دھکڑ کی جو تفصیل تاریخوں میں بیان ہوئی ہے، اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کوئی شخص قتل ہوا ہو یا بری طرح مجروح ہی ہوا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے شدید تر بلوے اور فسادات ہر دَور، ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں، لیکن ان پر کبھی بھی "بغاوت" کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ خود ہماری مملکت پاکستان میں ابھی تھوڑے دن پہلے پولیس کے لاٹھی چارج کا جواب جن لوگوں نے اینٹ پتھر سے دیا اور سیاسی نعرے بھی لگائے، کیا مفتی زادہ جناب عثمانی صاحب ان کے متعلق یہ فتویٰ دیں گے کہ وہ سب شرعی اصطلاح میں باغی اور واجب القتل تھے؟ عجیب ڈھنگ ہے کہ شرعی قوانین کی یہ نئی اور انوکھی تعبیرات کس علمی زعم کی بنا پر فرمائی جا رہی ہیں؟ پہلے یہ کہا گیا کہ حکام اور گورنروں پر قصاص، تعزیر یا تاوان نہیں خواہ وہ جَورِ صریح کے مرتکب ہوں۔ دیت اور تاوان بھی دیا جائیگا تو حاکم کی ذات سے نہیں بلکہ عامۃ المسلمین کی جیب سے یعنی بیت المال سے دیا جائے گا۔[1] اب یہ فرمایا جا رہا ہے

---

[1] ابنِ غیلان کے ہاتھ کاٹ دینے اور اُسے مواخذہ سے بالاتر قرار دینے کے حق میں جو نادر دلائل البلاغ میں پیش کیے گئے ہیں، میں جب انہیں پڑھ رہا تھا تو مجھے بے اختیار وہ دلائل یاد آ رہے تھے جو اُس پولیس آفیسر کے وکلاءِ صفائی نے پیش کیے ہیں جس کے خلاف لاہور کے ایک معروف عالمِ دین کو ٹھوکریں مارنے اور مجروح کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔

کہ جو شخص حکومت کے خلاف ہو، انتشار برپا کرنا چاہتا ہو" سب و شتم کا جواب سب و شتم سے دے، گرفتاری کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے کے بجائے مزاحمت کرے یا رُوپوش ہو جائے۔ اس کا جُرم بغاوت سے کم نہیں ہے اور اس کی سزا قتل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جرائم جن کو بغاوت کا نام دیا جا رہا ہے اور جن پر مسلمان کا خون هدر قرار دیا جا رہا ہے، ان جرائم پر تو ایک ذمّی کا خون بہانا بھی اسلام نے جائز نہیں سمجھا ہے اور اسے اپنے ذمّے سے خارج نہیں کیا ہے۔ اگر اس طرح کے مفتیوں کو حکومت یا عدالت کی کرسی پر بٹھا دیا جائے تو قانونِ اسلامی بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا اور مسلمانوں کو یہاں وہ حقوق و تحفظات بھی حاصل نہ رہ سکیں گے جو ایک اسلامی حکومت میں کفّار اور اہلِ ذمّہ کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ عثمانی صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ براہِ کرم اپنے والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحب سے یہ استفتا فرمائیں کہ اگر آج کوئی گورنر مسلمانوں کے مجمعِ عام میں اُٹھ کر تقریر کرے اور اس میں حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہے، اور اس پر کچھ مسلمان صبر نہ کر سکیں اور گورنر پر جُوتوں کی بارش کریں، اور گورنر جب ان کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس بھیجے تو وہ پولیس کا مقابلہ لاٹھیوں اور پتھروں سے کریں، تو کیا وہ سب باغی اور واجب القتل ہوں گے؟ مفتی صاحب اس کے جواب میں جو فتویٰ دیں وہ براہِ کرم البلاغ میں شائع کر دیا جائے۔

مَیں مدیر البلاغ کو مشورہ دُوں گا کہ وہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۱۲۴ اور ۱۲۴ الف کا ذرا مطالعہ فرمائیں۔ یہ قوانین ایک کافر، اجنبی اور فاتح قوم نے ایک مغلوب و مفتوح قوم پر نافذ کرنے کے لیے بنائے تھے۔ ان میں سامراجی اقتدار و تسلّط کو مستحکم کرنے اور قائم رکھنے کا پُورا پُورا اہتمام کیا گیا تھا اور محکوم اقوام کے شہری حقوق کم سے کم تجویز کیے گئے تھے۔ دفعہ ۱۲۴ کے تحت صدر یا گورنر کو بزور اپنے فرائض و اختیارات کے استعمال سے روکنا، ان میں مخل ہونا اور ان پر حملہ آور ہونا فوجداری جُرم ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات سال قید ہے۔ اس کے بعد دفعہ ۱۲۴ الف ہے، جس میں حکومت کے خلاف نفرت، حقارت اور عدمِ

---

*۔ دلائل یہی تھے کہ اس افسر سے مواخذہ قانوناً جائز نہیں، کیونکہ اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مزاحم ہونے والوں سے یہ سلوک کیا تھا جس میں وہ حق بجانب تھا۔ اچھا ہُوا کہ البلاغ کے دلائل وکیلِ صفائی کے ہاتھ نہ لگے ورنہ وہ شرعاً اس پولیس افسر کو حق بجانب اور ان عالمِ دین کو مجرم ثابت کرنے میں انہیں بھی کام میں لاتا۔

وفاداری کے جذبات ظاہر کرنے اور پھیلانے کو بغاوت قرار دیا گیا ہے، مگر اس کی سزا بھی موت نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ حبسِ دوام کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ اور اس دفعہ کی توضیح میں یہ بات بھی درج ہے کہ جائز قانونی ذرائع سے کام لے کر حکومت کے اقدامات پر تنقید کرنا اور ان میں تبدیلی کا مطالبہ کرنا جرم نہیں ہے۔ اب قوانینِ شرعیہ کی جو تفسیر و تشریح عثمانی صاحب پیش فرما رہے ہیں، اس کی رو سے اِن دونوں دفعات میں ترمیم کر کے ان میں زیادہ سے زیادہ سزا لازماً موت مقرر کرنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

گر ہمیں محتسب و ہمیں مُلّا کارِ طفلاں تمام خواہد شد

حضرت حجرؓ کا مقدمہ اور اس کی رُوداد حضرت حجرؓ اور آپ کے ساتھیوں کے جرائم کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کے خلاف بغاوت کا جو مقدمہ بنایا گیا اور جس طرح شہادتیں فراہم کی گئیں، ان میں کہاں تک اسلام کے قانونِ قضا اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا۔ تاریخ طبری جلد ۴ میں صفحہ ۱۹۰ سے لے کر صفحہ ۲۰۸ تک اس واقعہ کی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ ان صفحات کا حوالہ عثمانی صاحب نے بار بار دیا ہے اور مولانا مودودی پر ضروری باتیں حذف کرنے کا الزام لگا کر کہا ہے کہ "ہم ان باتوں پر تنبیہ کریں گے"۔ اب جن اجزاء کو انہوں نے خود حذف کیا ہے اور بحث و تنقیح کے جن ضروری پہلوؤں کو نظر انداز کیا ہے میں بھی ان کی نشان دہی کیے دیتا ہوں۔ طبری میں ص ۱۹۹ پر یہ بات درج ہے کہ زیاد نے حضرت حجرؓ کے بارہ ساتھیوں کو جیل میں ڈال دیا اور پھر محلوں کے سرداروں کو بلا کر کہا کہ "حجر کے بارے میں تم نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کی شہادت دو"۔ لیکن اس پوری بحث میں یہ بات کسی جگہ مذکور نہیں ہے کہ شہادت کے وقت حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کو بھی اپنا بیان یا صفائی پیش کرنے یا کسی گواہ پر جرح کرنے کا موقع دیا گیا ہو۔ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے روایت ہے:

قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الخصمین یقعدان بین یدی الحاکم۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ (یعنی عدالتی ضابطہ بیان) فرمایا ہے کہ مقدمے کے فریقین دونوں حاکم کے رُوبرو بیٹھیں۔

آنحضورؐ نے مزید فرمایا:

فاذا جلس بین یدیك الخصمان فلا تقض حتی تسمع کلام الآخر کما سمعت کلام الاوّل۔	جب دونوں فریق تمہارے سامنے بیٹھ جائیں تو فیصلہ نہ کرو جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لو جس طرح تم نے پہلے کی بات سُنی۔

حضرت عمرؓ نے جو ہدایت نامہ آدابِ قضا سے متعلق حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بھیجا تھا، وہ متعدد کتبِ فقہیہ میں منقول ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

سوّ بین الناس فی وجھك و مجلسك حتیٰ لا ییأس الضعیف من عدلك ولا یطمع الشریف فی حیفك۔	تم لوگوں کی جانب متوجہ ہونے اور اپنا اجلاس منعقد کرنے میں مساوات قائم کرو تاکہ کمزور تمہارے عدل سے مایوس نہ ہو اور بڑے خاندان والا تم سے بے انصافی کی طمع نہ کرے

ملزمین کے خلاف ان کی غیر موجودگی میں گواہیاں لینا ارشاداتِ نبویؐ اور اسلامی اصولِ قضاء کے بالکل خلاف ہے۔ اس پر اُس شہادت کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا جو اثباتِ جُرم کے لیے بنیاد بن سکے۔ پھر اسلامی قانونِ شہادت کے مطابق یہ بھی ضروری ہے کہ ہر گواہ کی گواہی الگ الگ لی جائے تاکہ پہلے کی گواہی سے دوسرا متاثر نہ ہو اور ان کی شہادت میں اگر اختلاف ہو جو ملزم کے حق میں مفید ہو، تو وہ اس فائدے سے محروم نہ ہو۔[1] لیکن زیاد کے سامنے چار اصحاب کی گواہی جس طرح تاریخ میں درج ہے، جسے عثمانی صاحب نے بھی نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب گواہوں نے بیک زبان اور بیک وقت ایک ہی گواہی دی ہے۔ تاہم اگر عثمانی صاحب کے وضع کردہ اصولِ عدمِ ذکر و ذکرِ عدم" کے تحت اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سب شہادتیں باری باری سے ملزمین کے سامنے پیش ہوئی تھیں اور انہیں بھی صفائی یا جرح کا موقع دیا گیا تھا مگر تاریخ میں ساری تفصیلات کو حذف کر کے صرف شہادت کا وہ مضمون بیان کر دیا گیا ہے جو تمام گواہوں کے مابین قدرِ مشترک تھا، تب بھی اس شہادت سے جرم بغاوت ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ چاروں حضرات کی گواہی البلاغ میں یوں نقل کی گئی ہے:

---

[1] معین الحکام ص۱۵ پر ادب القاضی للخصاف کے حوالے سے درج ہے۔ لو شھد شاھد و فسر الشھادۃ ثم شھد الآخر فقال اشھد علی مثل شھادۃ صاحبی لایقبل (اگر ایک گواہ شہادت دے اور اس کی تفصیل بیان کرے، پھر دوسرا گواہ کہے کہ میں اپنے ساتھی کی گواہی کے مثل گواہی دیتا ہوں تو دوسرے کی گواہی قبول نہ ہو گی)۔

"حجرؓ نے اپنے گرد جتھے جمع کر لیے ہیں اور خلیفہ کو کھلم کھلا گالیاں دی ہیں اور امیر المومنین کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی ہے اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آلِ ابی طالب کے سوا خلافت کا کوئی مستحق نہیں۔[1] انہوں نے ہنگامہ برپا کر کے گورنر کو نکال باہر کیا اور یہ ابو تراب (حضرت علیؓ) کو معذور سمجھتے اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے دشمن اور ان سے جنگ کرنے والوں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ ان کے ساتھیوں کے سرگروہ ہیں اور انہی جیسی رائے رکھتے ہیں۔"

اس شہادت میں حضرت حجرؓ بن عدی اور آپ کے ساتھیوں کے جو جرائم بیان ہوئے ہیں، میں ان پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی جرم بلکہ ان کا مجموعہ مل کر بھی بغاوت کی شرعی و اصطلاحی تعریف میں نہیں آسکتا۔ پھر ہر فعل کو اپنے پس منظر سے کاٹ کر مبالغے اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ گورنر کو نکال باہر کرنے والی بات تو بالکل خلافِ واقعہ ہے جو کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ گورنر کو نکال دینا تو درکنار خود حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھی گرتے پڑتے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے اور روپوش ہوئے تھے اور پھر زیاد سے امان لے کر خود ہی حاضر ہو گئے تھے۔ بہر کیف ان چار اصحاب کی شہادت نقل کرنے کے بعد عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"پھر زیاد نے چاہا کہ ان چار حضرات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس گواہی میں شریک ہوں چنانچہ اس نے ان حضرات کی گواہی لکھ کر لوگوں کو جمع کیا، ان کو یہ گواہی پڑھ کر سنائی اور لوگوں کو دعوت دی کہ جو لوگ اس گواہی میں شریک ہونا چاہیں، وہ اپنا نام لکھوا دیں۔ چنانچہ لوگوں نے نام لکھوانے شروع کیے، یہاں تک کہ ستر افراد نے اپنے نام لکھوائے۔"

شہادت فراہم کرنے کے اس طریقِ کار کو اگر کھینچ تان کر کے کسی طرح حدِ جواز میں لایا جا سکتا ہو، تب بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گواہیاں لینے کا یہ طریقہ اسلامی عدل و انصاف کے بنیادی اور معیاری تصورات

---

[1] واضح رہے کہ یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لوگ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کو صحیح مانتے تھے اور حضرت عثمانؓ کی بھی خلافت پر نہیں بلکہ ان کے بعض اعمال پر معترض تھے۔ اس لیے ان کی صحیح پوزیشن یہ تھی کہ وہ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ اور ان کے صاحبزادوں کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔

سے بالکل فروتر ہے۔ آخر سیاسی اجتماعات اور پبلک جلسوں میں قراردادوں کی منظوری لینے، محضرناموں پر لوگوں کے انگوٹھے لگوانے یا دستخط لینے اور مسلمانوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرتے وقت گواہوں کی شہادت ریکارڈ کرنے میں کچھ تو فرق و امتیاز ہونا چاہیئے۔ ہمارے فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ کسی گواہ کو کوئی خاص قسم کی "تلقین" نہ کی جائے جو اُس کی آزادانہ رائے پر اثرانداز ہو سکتی ہو۔ چنانچہ امام سرخسیؒ مبسوط جلد ۹ صفحہ ۱۰۲ پر فرماتے ہیں ولا ینبغی للقاضی ان یلقن الشهود ما تتم به شهادتهم فی الحدود لانه مامور بالاحتیال لدرء الحد لا لاقامته (قاضی کو چاہیے کہ وہ گواہوں کو ایسی بات نہ سمجھائے جس سے ان کی شہادت حدود میں پایۂ تکمیل و ثبوت تک پہنچے۔ کیونکہ قاضی اس بات پر مامور ہے کہ کسی بہانے سے حد کو ٹالے، نہ کہ اسے قائم کرے)۔ اِس کی روشنی میں ہم بہ آسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک پیشگی لکھی لکھائی "گواہی" تیار کر لینا اور صوبے کے گورنر کا لوگوں کو بلا کر یہ کہنا کہ اس گواہی میں کون کون شریک ہوتا ہے، شہادت فراہم کرنے کا یہ طریقہ اسلامی انصاف کے تقاضے کہاں تک پورے کر سکتا ہے۔ یہ حرکت تو اِس ظلم و ستم کے دَور میں بھی اگر کوئی گورنر کرے تو دنیا چیخ اُٹھے۔

یہاں یہ بات بھی لائقِ وضاحت ہے کہ عثمانی صاحب نے یُوں تو بہت سی غیر ضروری تفصیلات اور مکالمات وغیرہ کو تاریخ طبری سے نقل کر دیا ہے، لیکن جس مقام پر مندرجۂ بالا گواہی لیے جانے کا ذکر ہے، وہاں سے بعض نہایت ضروری اجزاء کو حذف کر دیا ہے۔ امام ابن جریرؒ اسی جگہ (ج ۴، صفحہ ۲۰۱) پر لکھا ہے کہ پہلے ایک گواہ (ابو بُردہ) سے گواہی لی گئی۔ پھر جو کچھ ہُوا، وہ درج ذیل ہے:

فقال زیاد علی مثل هذه الشهادة فاشهدوا اما واللّٰه لاجهدن علی قطع خیط عنق الخائن الاحمق فشهد رؤوس الارباع علی مثل شهادته وکانوا اربعة ثم ان زیاداً دعا الناس فقال اشهدوا علی مثل شهادة رؤوس الارباع فقرأ علیهم الکتاب۔	پھر زیاد نے کہا کہ اِس شہادت کے مانند شہادت دو۔ خدا کی قسم میں اس خائن و احمق کی رگِ گردن کاٹنے کی پُوری جدوجہد کروں گا۔ پس محلّوں کے سرداروں نے اسی شہادت کے مطابق گواہی دی اور وہ چار تھے۔ پھر زیاد نے لوگوں کو بلایا اور کہا کہ جس طرح محلّوں کے سرداروں نے شہادت دی ہے، اسی طرح کی شہادت دو اور انہیں وہ تحریری شہادت پڑھ کر سنائی۔

دوسرے لفظوں میں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زیاد صرف گرفتاری سے پہلے ہی قاتلانہ دھمکیاں نہیں دیتا رہا (جیسے عثمانی صاحب بھی نقل کر چکے ہیں) بلکہ وہ حضرت حجرؓ کے خلاف جس وقت شہادتیں لے رہا تھا اُس وقت بھی ایک قصاب کی طرح اپنی نیت اور ارادے کا برملا اظہار کر رہا تھا کہ میں اس احمق اور غدار کو تہِ تیغ کرنے میں پورا زور لگاؤں گا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا بلکہ ایک گواہی پڑھ کر سنا رہا تھا کہ تم لوگ اس طرح کی گواہی دو۔ ابن جریرؒ کی تصریح کے مطابق اس کے بعد ستر گواہوں نے ویسی ہی گواہی دی۔ اس ساری رُوداد کو پڑھتے ہوئے آدمی یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ایوب خاں کا گورنر عبدالمنعم خاں بھی اتنی دُور تک نہ جا سکا جہاں تک عثمانی صاحب کا یہ ممدوح گورنر پہنچ گیا۔

اسلامی قانونِ شہادت کی مزید خلاف ورزی | پھر مزید ایک واقعہ جو تاریخ طبری اور دوسری تاریخوں میں مذکور ہے اور جسے البلاغ میں نظر انداز کر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان گواہوں میں مشہور قاضی شُریح بن حارث اور شُریح بن ہانی دونوں کا نام بھی زیاد نے درج کر دیا تھا۔ قاضی شُریح کا اپنا بیان تاریخ طبری اور البدایہ والنہایہ میں یہ درج ہے کہ میں نے گواہی صرف یہ دی تھی کہ حُجرؓ ایک عبادت گزار اور روزے دار شخص ہیں۔ اور شُریح بن ہانی کا یہ قول منقول ہے کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا نام گواہوں میں درج کر دیا گیا ہے اور میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے زیاد کو ملامت کی ہے۔" صرف یہی نہیں بلکہ ابن جریرؒ نے آگے صفحہ ۲۰۲ پر بیان کیا ہے کہ جب زیاد نے حضرت حُجرؓ اور ان کے ساتھیوں کو حضرت وائل اور کثیرؓ بن شہاب کی حراست میں امیر معاویہؓ کی طرف روانہ کیا اور ساتھ وہ "شہادت نامہ" بھی بھیجا تو شُریح بن ہانی راستے میں انہیں جا ملے اور کثیرؓ کے حوالے ایک بند مکتوب کیا جو امیر معاویہؓ کے نام تھا۔ کثیرؓ نے اس کا مضمون پوچھا تو شُریح نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر کثیر گھبرائے کہ معلوم اس میں کوئی ایسی بات ہو جو امیر معاویہؓ کو ناپسند ہو اور وہ خط لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ پھر شُریح نے وہ خط حضرت وائل کے سپرد کر دیا اور انہوں نے امیر معاویہؓ تک پہنچا دیا۔ امیر معاویہؓ نے اسے کھولا تو اس میں شُریح کی جانب سے تحریر تھا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ زیاد نے حجرؓ کے خلاف میری شہادت بھی درج کر کے بھیجی ہے۔ میری شہادت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں۔ ہمیشہ حج و عمرہ کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں۔ اُن کے خون اور مال پر دست درازی حرام ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ زیاد نے جعل سازی اور شہادتِ زُور کے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور گواہوں کو سکھانے پڑھانے کی ہر کوشش کے باوجود اس نے جب دیکھا کہ بعض گواہ اس کے مطلب کی گواہی نہیں دیتے تو اس نے ان کی طرف سے جھوٹی گواہی گھڑ کر درج کر دی۔ زیاد کی یہ مجرمانہ حرکت گواہیوں کے اِس سارے دفتر کو مشتبہ اور ناقابلِ وثوق بنا دیتی ہے۔ کیونکہ جو شخص ایک گواہ پر بہتان باندھ سکتا ہے، وہ ایک سے زاید پر بھی باندھ سکتا ہے۔ مولانا عثمانی صاحب نے ابن خیلان کو شک کا فائدہ دے کر بری الذمہ ثابت کرنے میں تو بڑا زور صرف کیا تھا، مگر یہاں حضرت حُجرؓ کے معاملے میں معلوم نہیں ملزم کو شک کا فائدہ ملنے کا اصول کہاں غائب ہو گیا؟ پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے اس صورتِ حال کے سامنے آ جانے پر بھی یہ ضروری خیال نہ فرمایا کہ شریحؒ یا دوسرے گواہوں کو یا زیاد کو بلا کر ملزمین کے سامنے بیان لیے جائیں اور ملزمین کو بھی بیان اور جرح کا موقع دیا جائے[1]۔ بلکہ دو گواہ جو قیدیوں کو ساتھ لائے تھے ان کے اور قیدیوں کے بیان بھی آمنے سامنے نہیں لیے گئے اور بس زیاد کی بھیجی ہوئی گواہی اور رپورٹ پر قتل کا فیصلہ کر ڈالا گیا، حالانکہ زیاد کی تحریر کی حیثیت ایک تفتیشی افسر کی ڈائری سے زیادہ کی نہیں تھی اور جب تک باقاعدہ عدالتی کارروائی کے مطابق اُسے فریقین کے سامنے ثابت نہ کیا جاتا، اس پر شہادت کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس پُوری کارروائی کے دوران میں ایک مرتبہ بھی زیاد یا امیر معاویہؓ نے ملزموں کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ اپنا بیان دے سکیں یا اپنے خلاف گواہی سُن سکیں یا کسی گواہ پر جرح کر سکیں۔ بلکہ انہیں آخر وقت تک یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ تاریخ طبری (ج ۴، ص ۲۰۳) میں تصریح ہے کہ جب سارے ملزم مَرجِ عذراء کے مقام پر محبوس کر دیے گئے تو وہاں انہیں یزید بن حجیہ کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ انہیں قتل کی سزا

1۔ گواہوں کی گواہی کے وقت ملزموں کی موجودگی جس طرح دوسرے عدالتی نظاموں میں لازم ہے، اسی طرح اسلام میں بھی ہے۔ شہادت علی الغائب اور قضاء علی الغائب بعض خاص صورتوں کے ماسوا جائز نہیں۔ موجودگی کے ساتھ گواہوں کے لیے جرح کا حق بھی مسلّم ہے جس کے بغیر شہادت ناقابلِ اعتماد ہے۔ حضرت مغیرہؓ پر خلافتِ فاروقی میں زنا کا جو مقدمہ قائم ہوا تھا وہ حضرت مغیرہؓ کی گواہوں پر جرح ہی کے باعث ثابت نہ ہو سکا تھا اور اُلٹا گواہوں پر حدِّ قذف جاری کی گئی تھی، حالانکہ گواہوں میں صحابی بھی تھے۔

ملنے والی ہے۔ اس پر حضرت حجرؓ نے یزید سے کہا کہ وہ امیر معاویہ سے جا کر کہیں کہ "ہم اپنی بیعت پر قائم ہیں۔ ہمارے خلاف گواہی عداوت و اتہام پر مبنی ہے"۔ یزید نے یہ پیغام پہنچا دیا مگر امیر معاویہؓ نے اس کے جواب میں فرمایا زیاد اصدق عند نا من حجر (زیاد ہمارے نزدیک حجرؓ سے زیادہ سچا ہے)۔

عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ زیاد نے "گواہیوں کا صحیفہ شرعی اصول کے مطابق حضرت وائل اور حضرت کثیرؓ کو دیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کو پہنچائیں۔ معلوم نہیں "شرعی اصول کے مطابق صحیفہ پہنچانے" سے مراد کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ عثمانی صاحب غالباً اسے "کتاب القاضی الی القاضی" یا "شہادۃ علی الشہادۃ" کے فقہی قاعدے کے تحت لا کر اس کارروائی کو شرعی اصول کے مطابق قرار دینا چاہتے ہیں۔ یہ "شہادت" جیسی کچھ بھی تھی اور جیسے کچھ "آداب قضا" کو ملحوظ رکھتے ہوئے حاصل کی گئی تھی، اس پر تو میں اوپر روشنی ڈال ہی چکا ہوں۔ مگر میں عثمانی صاحب پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اول تو انتظامی حاکم، یعنی گورنر کو قاضی قرار دینا ایک انوکھی اُپج ہے۔ پھر فقہائے حنفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کتاب القاضی الی القاضی یا شہادۃ علی الشہادۃ غیر فوجداری یعنی دیوانی و مالی (CIVIL) معاملات ہی میں معتبر ہے، حدود و قصاص یعنی فوجداری (CRIMINAL) معاملات میں ہرگز معتبر نہیں ہے۔ وہ فقہ کی کوئی کتاب اُٹھا کر خود ہی دیکھ لیں، میں حوالے کہاں تک نقل کرتا رہوں۔ فقہائے حنفیہ نے اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک قاضی کے مکتوب کا دوسرے کے لیے قابلِ قبول ہونا اور اسی طرح ایک شاہد کا دوسرے شاہد کی شہادت کو پیش کرنا خلافِ قیاس ہے اور اسے صرف استحساناً جائز سمجھا گیا ہے۔ ورنہ یہ دونوں "شبہ" سے خالی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تحریر اصل قاضی کے بجائے کسی غیر کی ہو یا شہادت نقل کرنے میں سہو ہو جائے، اور فوجداری جرائم میں بیانات و شہادت کا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہونا ضروری ہے۔ اس لیے زیاد کا جو مکتوب اور گواہیوں کا جو صحیفہ امیر معاویہؓ کے پاس پہنچا تھا، وہ اس اصول کے مطابق بھی ہرگز کسی قانونی قدر و قیمت کا حامل یا اعتماد کے لائق نہ تھا۔ لیکن حیرت بالائے حیرت ہے کہ مدیر البلاغ پھر بھی فرماتے ہیں کہ "حضرت معاویہؓ کو حجرؓ کی شورشوں کا پہلے ہی علم تھا، اب اُن کے پاس چوالیس قابلِ اعتماد گواہیاں ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر پہنچ گئیں۔ جُرمِ بغاوت کو ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ جرم روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گیا اور بغاوت کی سزا موت ہے"! اس ارشاد سے مدیر البلاغ نے اصولِ فقہ میں ایک اور نادر اضافہ فرما دیا ہے،

...دہ یہ ہے کہ حاکم کے فیصلے میں کسی شخص کے متعلق اس کے مجرم ہونے کا پیشگی علم بھی جائز طور پر دخیل ہو سکتا ہے۔
...بات ہے جو اسلامی فقہ تو درکنار، دنیا کے کافرانہ قوانین تک میں غلط سمجھی جاتی ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

پھر عثمانی صاحب لکھتے ہیں "اس کے باوجود حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ کو قتل کرنے کا حکم دیا" سوال یہ ہے کہ اس دوگونہ اور امتیازی سلوک کی وجہ کیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عثمانی صاحب نے اس سوال کا نیا جواب بعض پوچھنے والوں کو یہ دیا ہے کہ باغی کا قتل واجب نہیں، صرف جائز ہے، اس لیے امیر معاویہؓ نے جسے چاہا قتل کرا دیا، جسے چاہا معاف کر دیا۔ ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے! اس کے معنی تو یہ ہیں کہ عثمانی صاحب حضرت معاویہؓ کو ماشاء اللہ یَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ کے مقام عالی پر فائز کرنا چاہتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معاملہ عدالت کا نہیں مشیت کا تھا!

میں یہ حقیقت کھول کر بیان کر چکا کہ اوّل تو یہ اصحاب ہرگز باغی نہ تھے، اور بالفرض اگر تھے بھی تو گرفتار ہو جانے کے بعد مجرد جرم بغاوت کی سزا ہرگز قتل نہیں ہے۔ اب میں عثمانی صاحب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ چبا چبا کر بات کرنے کے بجائے صاف صاف بتائیں کہ انہوں نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ باغی اسیر کا قتل واجب تو نہیں مگر جائز ہے؟ یہ قتل کا جواز ان کی تحقیق میں حد کے تحت آتا ہے یا تعزیر کے تحت؟ مجرموں کا جرم اور ان کے خلاف شہادت یکساں ہو تو بعض کو چھوڑنا اور بعض کی گردن مار دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ حجرؓ ان کے سرغنہ تھے تو فقط اُن کا جرم شدید تر تھا، باقی تو جرم میں برابر تھے، پھر اُن میں سے بھی صرف چند کا انتخاب برائے قتل کس بنا پر ہوا؟ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو رہا کیا گیا، اس بنا پر کیا گیا کہ ان کے کسی دوست یا عزیز نے سفارش کر دی۔ حالانکہ قصاص و حدود میں شفاعت کرنا اور اسے مان لینا اسلامی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں ہے۔ پھر عجیب تر چیز یہ ہے کہ جن لوگوں کے نام زیاد کی رپورٹ میں بطور گواہ درج تھے، انہی میں سے بعض حضرات ایسے ہیں جنہوں نے بعض ملزموں کی سفارش کر کے انہیں رہا بھی کرایا ہے۔ پھر جو سفارش بھی کی گئی، اس بنا پر نہیں کہ فلاں شخص بے گناہ یا بے قصور ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ یہ ہمارا آدمی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دورِ ملوکیت کے خصائص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک طرف ملزم کے خلاف شہادت دی جائے، دوسری طرف اُسے چھڑانے کیلئے سفارش کی جائے اور اُسے قبول بھی کر لیا جائے اور جس کا کوئی سفارشی نہ ہو اُسے قتل کر دیا جائے۔ اسلام کے تصورِ عدل و انصاف کے ساتھ اس سے بڑا اور سنگین تر استہزاء اور کیا ہو سکتا ہے؟

(باقی)